بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مشینی انسان ــــ اور ــــ قرآنی نظام

پرویز

یہ واقعہ ہے مملکتِ خداداد پاکستان کے دارالسلطنت، اسلام آباد کا، جسے احمد بشیر صاحب نے، ڈوبتے ہوئے دل، کانپتے ہوئے ہاتھوں اور بھیگی ہوئی پلکوں کے ساتھ لکھا ہے اور روزنامہ دی مسلم کی اشاعت بابت ۲۴ اپریل ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا ہے۔ اس کا رواں ترجمہ ملخصاً درج ذیل کیا جاتا ہے، متعلقہ نام احتیاطاً حذف کرتے ہوئے۔

وہ ایک ممتاز خاندان کی نہایت ہونہار بچی تھی۔ آرٹ کی طالبہ۔ والدہ اہلِ قلم۔ والد ادیب بھی اور شاعر بھی۔ اور اس کے ساتھ حکومتِ پاکستان کی طرف سے، ہندوستان میں ایک اعلیٰ منصب پر فائز۔ بچی نے تین دن بعد، اپنی بیسویں سالگرہ منانے کے لئے اپنے ابّو کے پاس جانا تھا کہ اسے بخار آیا، اور ۸ اپریل کی شام حالت اچانک بگڑ گئی اور اس حد تک کہ معالج نے، جو خود ایک ماہر ڈاکٹر تھے، فیصلہ کیا کہ اسے فوراً آکسیجن ملنی چاہیئے۔ اسلام آباد کے پالی ٹیکنیک ہسپتال میں لیبارٹری نہیں۔ اس کے لئے نیشنل ہیلتھ لیبارٹری کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ وہ لیبارٹری ۵ بجے بند ہو جاتی ہے اور اس وقت ساڑھے پانچ بج چکے تھے۔ مریضہ کی والدہ کار میں بیٹھیں۔ بچی کو اپنی گود میں لٹایا۔ اور اس کے چھوٹے بھائی، اور ڈاکٹر کے ہمراہ، تیزی سے .... ہسپتال، راولپنڈی کی طرف روانہ ہو گئے۔ وقت کا ایک ایک لمحہ مریضہ کی کشمکشِ موت و حیات میں اضافہ کئے جا رہا تھا، اس بیم و رجا کے عالم میں یہ مسافت خدا خدا کر کے طے ہوئی۔ چھ بج کر دس منٹ پر ان کی کار، (M. I. ROOM.) کے سامنے کھڑی تھی۔ حالات کی نزاکت کا تقاضا تھا کہ مریضہ کو ایک ثانیہ کی تاخیر کے بغیر آکسیجن مل جائے، لیکن

اور یہی وہ "لیکن" ہے جس کے لئے ہم نے اس جانگداز واقعہ کو اپنے ہاں پیش کرنے کی ضرورت سمجھی ہے۔ وہ لیکن یہ ہے کہ ہسپتال کے اس وقت کے انچارج نے کہا کہ مریضہ چونکہ (CIVILIAN) ہے اس لئے اسے ویسے ہی داخل نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لئے پہلے فلاں فلاں فارم پُر کرنے ہوں گے۔ اتنی رقم پیشگی جمع کرانی ہوگی۔ اس کے بعد متعلقہ اتھارٹی کی اجازت سے مریضہ کو داخل کیا جا سکے گا۔

مریضہ زندگی کے آخری سانس گن رہی تھی۔ حرماں نصیب ماں، اسے اپنی گود میں لئے حسرت بھری نگاہوں سے اس کی ڈوبتی ہوئی آنکھوں کو دیکھ رہی تھی۔ ڈاکٹر مایوسی کے آخری لمحات میں اس کی نبض ٹٹول رہا تھا۔ اس کا بھائی (FORMALITIES) کی تکمیل کے لئے اِدھر اُدھر مارا مارا پھر رہا تھا۔ پچھ بج کر پچاس منٹ پر خدا خدا کر کے یہ مراحل طے ہوئے تو انچارج صاحب نے ملازموں سے کہا کہ مریضہ کو اندر لے آؤ۔ وہ کار کے قریب پہنچے لیکن مریضہ بھی لرزتے ہوئے ہونٹوں سے اپنی ماں کو الوداعی سلام کر کے پہلے ہی جا چکی تھی۔

ہسپتال کی انتظامیہ مطمئن تھی کہ انہوں نے قواعد و ضوابط کی خلاف ورزی نہیں ہونے دی!

(۰)

اور یہ بھی اسی اسلام آباد کا واقعہ ہے۔ وقاص شاہین، ایک چھوٹا سا بچہ خون کے سرطان کے مہلک مرض کا شکار ہے جس کا پاکستان میں علاج نہیں ہو سکتا۔ غریب باپ کی فریاد کسی نہ کسی طرح، صدرِ مملکت کے کانوں تک پہنچ گئی اور انہوں نے، وزیرِ صحت کے مشورہ کے بعد ازراہِ شفقت اور ہمدردی حکم صادر فرمایا کہ بچے کو سرکاری اخراجات پر علاج کے لئے باہر بھیج دیا جائے۔ اس پر اس مریض کے نام کا فائل کھل گیا۔ یہ فائل، ایوانِ حکومت کی غلام گردشوں میں چکر لگا رہا ہے —— کبھی ایک منسٹری میں، کبھی دوسری میں۔ فائل چکر پہ چکر کاٹ رہا ہے اور بچے کی حالت نازک سے نازک ہوتی جا رہی ہے۔ غریب باپ ایک ایک کی منتیں کر رہا ہے۔

یہ خبر، روزنامہ دی مسلم کی ۶ مئی ۱۹۸۱ء کی اشاعت میں شائع ہوئی تھی۔ معلوم نہیں اس کے بعد اس فائل اور اس بچے پر کیا بیتی؟[1]

(۰)

ہم نے نہ تو پہلا واقعہ اس لئے درج کیا ہے کہ متعلقہ ہسپتال کے ذمہ دار اربابِ انتظامیہ کے رویہ کے خلاف کوئی شکایت کی جائے۔ اور نہ ہی دوسرا واقعہ۔ اس لئے کہ متعلقہ محکموں کے جہانِ سنگ و خشت میں انسانی قلب کی تلاش کی جائے۔ ہم نے ان واقعات کو (جو اسی قسم کے سینکڑوں واقعات کی مثالیں ہیں) کسی اور مقصد کے لئے درخورِ اعتنا سمجھا ہے۔

ان واقعات کے ذمہ دار نہ تو متعلقہ ہسپتال کے اربابِ بست و کشاد ہیں اور نہ ہی ان محکموں کے حساب

---

[1] ۲۸ مئی ۱۹۸۱ء کے "دی مسلم" میں یہ خبر چھپی ہے کہ اس بچے کی حالت بےحد نازک ہو چکی ہے اور فائل ابھی تک، سپٹنک کی طرح، دنا تر کی لامتناہی فضاؤں میں گھوم رہا ہے۔ صدرِ مملکت نے کہا تھا کہ بچے کے باپ کو، جو سرکاری ملازم ہے، کسی ایسے ملک میں تعینات کر دیا جائے جہاں اس کے بچے کا علاج ہو سکے۔ یہ ڈیڑھ ماہ پہلے کی بات ہے۔ سوچئے کہ جس نظام میں صدرِ مملکت کے حکم کی تعمیل اس طرح ہوتی ہو، وہاں عام معاملات کا حشر کیا ہوتا ہوگا؟

حل و عقد۔ اس کا ذمہ دار ہے وہ نظام حکومت جسے بیوروکریسی کے (BUREAUCRACY) کے نام

بیوروکریسی

سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ لفظ اور اس کا (غلط العوام ترجمہ) "نوکر شاہی" آپ نے سینکڑوں بار پڑھا اور سنا ہوگا لیکن اس کے مفہوم یا مطلب پر کم غور کیا ہوگا۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب کوئی نئی مشین باہر سے آتی ہے تو اس کے ساتھ ایک پمفلٹ ہوتا ہے جس میں اس مشین کے کل پرزوں کی تفصیل درج ہوتی ہے اور یہ بتایا گیا ہوتا ہے کہ مشین میں فلاں نقص پیدا ہو جائے تو کیا کرنا چاہیئے۔ اس مشین کا اپریٹر اس مشین کو چلاتا رہتا ہے اور اگر اس میں کوئی نقص پیدا ہو جائے تو جھٹ سے پمفلٹ کھول کر متعلقہ ہدایات کا مطالعہ کرتا اور ان کے مطابق مشین کی اصلاح کر دیتا ہے۔ اس سارے عمل میں ایک بات قابلِ غور ہے۔ اور وہ یہ کہ ایسا کرتے وقت اس کا صرف دماغ کام کرتا ہے۔ اس کے دل کا اس سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔ دل کا واسطہ انسانوں سے ہوتا ہے مشینوں سے نہیں۔

مغرب کی مادہ پرستی (MATERIALISM) سے جب تصورِ حیات میں تبدیلی آئی تو اس کی رُو سے انسانوں کو بھی مشینیں تصور کر لیا گیا۔ اسے کہتے ہیں (MECHANICAL CONCEPT OF LIFE) ہیں۔ اس سے انسانوں کے (HUMAN BEINGS) ہونے کا تصور ختم ہوگیا اور ان کے معاملات کا حل اسی طریق سے سوچا جانے لگا جس طریق سے کسی مشین کا نقص دُور کیا جاتا ہے۔ اس طریق کی رو سے انہوں نے حکومتی نظم و نسق کے لئے بھی کچھ قواعد و ضوابط منضبط کئے۔ اور ان کے پمفلٹ متعلقہ شعبوں میں بانٹ دیئے۔ منتظمہ کے کارپردازوں کو ان قواعد و ضوابط کی تعلیم دی گئی اور انہیں سمجھا دیا گیا کہ جو مسئلہ (CASE) ان کے سامنے آئے اس کے متعلق دیکھ لیا جائے کہ اس پمفلٹ میں کیا لکھا ہے۔ اس کے مطابق اس معاملہ کا تصفیہ کر دیا جائے اور ایسا کرنے میں کسی انسانی تقاضا کو دخل انداز نہ ہونے دیا جائے۔ ان انسانوں کو مشین سمجھا جائے اور اپنے آپ کو مشین کا آپریٹر۔ اس نظام حکومت کو بیوروکریسی کہا جاتا ہے۔ یعنی "میزوں کی حکومت" (اس لفظ کے بنیادی معنی یہی ہیں)۔ فائلوں کی حکومت۔ کاغذوں کی حکومت۔ اس نظام حکومت میں سب سے زیادہ قابل۔ دیانتدار۔ ذمہ دار۔ معتمد علیہ افسر، اسے سمجھا جاتا ہے جو متعلقہ افراد کو انسان سمجھے بغیر، ان کے معاملات کا متعلقہ قواعد و ضوابط کے مطابق فیصلہ کر دے۔ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو اسے کبھی اس کا اطمینان ہو جاتا ہے کہ اس نے اپنے فرائض کو پوری ذمہ داری کے ساتھ ادا کر دیا، اور افسرانِ بالا بھی اس کی فرض شناسی کی تعریف کرتے ہیں۔ ان میں سے کسی کو اس سے واسطہ نہیں ہوتا کہ اس سے انسانیت پر کیا بیتی؟ یہ گوشہ ان کی ذمہ داری کے احاطہ ہی میں نہیں ہوتا۔ جب اس ہسپتال کے ملازمین نے، قواعد و ضوابط کی پابندی کے مطابق ہسپتال کا دروازہ نہیں کھولا تھا تو وہ پوری طرح مطمئن تھے کہ انہوں نے جو کچھ کیا ہے ٹھیک کیا ہے۔ انہیں اس سے غرض نہیں تھی کہ

اس سے اس مریضہ کا انجام کیا ہوا؟ حتیٰ کہ اگر مرحومہ کی موت کے متعلق کوئی انکوائری بھی ہو اور یہ ثابت ہوجائے کہ انہوں نے جو کچھ کیا تھا قاعدے اور قانون کے مطابق کیا تھا، تو انہیں اس کے لئے موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جائے گا۔ اس کے برعکس، اگر یہ معلوم ہوجائے کہ انہوں نے کسی قاعدے کی خلاف ورزی کی تھی (خواہ وہ مریضہ کی جان بچانے کے لئے ہی کیوں نہ ہو) تو انہیں چارج شیٹ دیدیا جائے گا۔ بیوروکریسی کا یہی تقاضا ہے۔

بیوروکریٹ اس نظام کو اس لئے گلے سے لگائے رکھتے ہیں کہ اس میں انہیں نہ معاملات کے فیصلہ میں چنداں کاوش کرنی پڑتی ہے، نہ اس کے عواقب کی کوئی ذمہ داری ان پر عائد ہوتی ہے۔ جب وہ متنازعہ امور کا فیصلہ متعلقہ قواعد و ضوابط کی رُو سے (میکانکی طور پر) کردیتے ہیں تو اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہوجاتے ہیں۔ یہ خلش انہیں ستاتی ہی نہیں کہ اس سے "انسانیت" پر کیا گذری ہے؟

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام کشتی کسی کی پار لگے، درمیاں رہے

آج ہمارا معاشرہ جس اضطرابِ پیہم کی آماجگاہ بن رہا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاں انسانی معاملات کا فیصلہ قواعد و ضوابط کے مطابق، ندیانہ طور پر کیا جاتا ہے، وہاں انسانی تقاضوں (HUMAN-CONSIDERATION) کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا.... وہاں ترجیح "فارمز کے پُر کرنے" کو دی جاتی ہے، انسانی زندگی کو نہیں۔ اور جہاں ان ضوابط میں لچک پیدا کی جاتی ہے تو اس کا جذبۂ محرکہ ذاتی مفادات (رشوت ستانی اور بدعنوانی) ہوتا ہے۔ نتیجہ دونوں کا کرب و اضطراب اور عدمِ سکون و اطمینان ہوتا ہے۔

---(۰)---

ان لوگوں کی یہ ذہنیت اور یہ اندازِ عمل، ان کی سرکاری زندگی تک ہی محدود نہیں رہتا۔ رفتہ رفتہ یہ ان کی فطرتِ ثانیہ بن جاتا ہے۔ معاشرتی زندگی کا کوئی گوشہ ہو، ان کے تعلقات اور روابط یکسر مشینی بن کر رہ جاتے ہیں۔ ان میں انسانی حسیات کی رعایت یا جذبات کی لطافت کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ ان کے گھر کی زندگی بھی "بابوآنہ" بن کر رہ جاتی ہے۔ آپ نے کھانے پینے کی بعض درآمدی چیزوں پر لکھا دیکھا ہوگا:-

(UN-TOUCHED BY HAND DURING MANUFACTURE)

ان کے بنانے میں ہاتھ کو نہیں چھونے دیا گیا۔

ان حضرات کی زندگی بھی کچھ ایسی ہی ہوجاتی ہے۔ یہ بالکل (ROBOTS) مشینی انسان بن کر رہ جاتے ہیں۔[1]

---

[1] ان میں مستثنیات بھی ہوتے ہیں جو اس جہانِ سنگ و خشت میں ذوقِ لطیف اور حسیاتِ انسانی کو برقرار رکھتے ہیں۔ لیکن ایسا کرنے میں انہیں کس قدر مشقت اٹھانی پڑتی ہے اس کا اندازہ باہر کا آدمی کم لگا سکتا ہے۔

جب خود اپنے بال بچوں کے ساتھ ان کا رویہ اس قسم کا مشینی ہو، تو دوسرے انسانوں کے ساتھ اُن کے برتاؤ میں لوچ کیسے آسکے گی۔ اقبال نے کہا تھا کہ ؎

بملازمان سلطاں خبرے دہم ز رازے — کہ جہاں توان گرفتن بنوائے دلگدازے

"نوائے دل گداز" سے یہ آشنا ہی نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ "جہاں گیری" تو ایک طرف، جب یہ کرسی چھوڑ کر "ریٹائر" ہوتے ہیں تو انہیں معاشرہ میں ایک بھی ہمنوا نہیں ملتا۔ یہ "یوسفِ بے کارواں" کی طرح اکیلے پھرتے رہتے ہیں۔

انہیں وقت گزارنے کے لئے کوئی ٹھکانہ نہیں ملتا۔ قفس کے خوگر پرندے کی طرح اُٹھتے ہیں تو دفتروں کا رُخ کر لیتے ہیں لیکن وہاں کی فضا ایسی بدلی ہوئی پاتے ہیں کہ پہلے برآمدے میں ان کے پاؤں کی آہٹ پاکر بابو لوگ کمرے کے اندر اپنی نشستوں سے اُٹھ کر کھڑے ہو جاتے تھے اور اب کیفیت یہ ہوتی ہے کہ کمروں کے اندر جاتے ہیں تو کوئی کرسی تک کی پیش کش نہیں کرتا۔ یونہی جھوٹی ہنسی کے ساتھ کبھی اِس کے پاس کبھی اُس کے پاس کھڑے ہو کر واپس آجاتے ہیں۔ میر تقی نے غالباً انہی کے متعلق کہا تھا کہ

تیرے کوچے ہر بہانے یوں ہی دن سے رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا!

اس سے کہیں زیادہ عبرت انگیز اور قابلِ رحم اُن کی ایک اور حالت ہوتی ہے۔ ریٹائر ہوتے ہیں تو "فتوحاتِ بالائی" کا سلسلہ بھی ختم ہو جاتا ہے اور جو پنشن ملتی ہے، وہ تنخواہ کے نصف سے بھی کم ہوتی ہے، لیکن پنشن اُسی دن نہیں مل جاتی اُسے منظور کرانے کے لئے دنوں، مہینوں، سالوں تک دفتروں کے چکر لگانے پڑتے ہیں اور وہاں کے مشینی انسان ان کی حالتِ زار پر کبھی ترس نہیں کھاتے۔ بعض تو انہیں چکروں کے راستے عدم آباد تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ ہر ایک سے شکایت ہی نہیں فریاد کرتے ہیں کہ پنشن سے متعلق دفاتر کی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے انسان نہیں پتھر کے بُت ہیں جنہیں اس کا قطعاً خیال نہیں آتا کہ مجھ پر اور میرے بال بچوں پر کیا گزر رہی ہے۔

ایسا کہتے وقت انہیں قطعاً یاد نہیں رہتا کہ کل تک وہ بھی اِنہیں کرسیوں پر پتھر بن کر بیٹھے رہتے تھے۔ اور انہیں بھی کسی کے حالِ زار پر ترس نہیں آتا تھا۔ وہ ہر غرضمند کو یہ کہہ کر دھتکار دیتے تھے کہ میں قواعد و ضوابط کے ہاتھوں مجبور ہوں۔

مذہب میں مشینی عمل

مذہب کی دنیا میں پہنچ کر رسوم پرستی اور بھی گل کھلاتی ہے۔ الدین زندگی کے حدود متعین کرتا ہے جن کے اندر رہتے ہوئے فرد کو فکر و عمل کی آزادی ہوتی ہے۔ اس کے لئے اسے اپنے لئے آپ فیصلہ کرنا اور اس فیصلے کی ذمہ داری قبول کرنا ہوتا ہے۔ اسے دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ وہ فیصلہ ان مقاصد کی سمت ایک قدم ہے جسے الدین نے متعین کیا ہے۔

اور وہ مقصد ہے۔ ما ینفع الناس ..... (۱۳/۱۷) "جو نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہو" اس سے اس فرد کی ذات میں بھی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی ہے، اور اس کے معاشرہ میں بھی نکھار پیدا ہوتا ہے۔ لیکن مذہب میں اس کی آزادی اور خود فیصلہ لینے کی صلاحیت کو کچل کر رکھ دیا جاتا ہے۔ آپ فقہ کی کسی کتاب کو اٹھا کر دیکھئے۔ اس میں انسان کے ایک ایک قدم کیلئے متعین "شرعی احکام" منضبط ملیں گے۔ بیٹھو اس طرح۔ اٹھو اس طرح۔ چلو اس طرح۔ سوؤ اس طرح۔ کھاؤ اس طرح۔ پیو اس طرح۔ غسل اس طرح کرو۔ بیت الخلاء میں یوں جاؤ۔ حتیٰ کہ اس میں میاں بیوی کے جنسی اختلاط کے لئے بھی قواعد و ضوابط ہوں گے۔ ان قواعد و ضوابط کی پابندی میکانکی طور پر کی جائے گی کیونکہ ان سے مقصد، ان کی پابندی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ نتیجہ یہ کہ جو شخص جتنا زیادہ ان احکام کا پابند ہوگا وہ اتنا ہی زیادہ عبوسًا قمطریرًا! ..... قسم کی چوبِ خشک بن جائے گا جس میں انسانی زندگی کی لوچ اور لچک کا شائبہ تک نہیں ہوگا۔ دہلی میں ایک بہت بڑے مفتی صاحب تھے۔ ان کی بدنصیب بیوی اکثر بیمار رہتی تھی۔ وہ ایک دن اس سے کہہ رہے تھے کہ نکاح نامہ کی رُو سے تمہارا نان و نفقہ تو میرے ذمے ہے، علاج معالجہ نہیں۔ اس کے لئے تمہیں اپنے ماں باپ سے کہنا ہوگا۔ اس قسم کی بن جاتی ہے "فطرت" ان لوگوں کی جو احکامِ شریعت کی پابندی اس طرح کرتے ہیں۔ پھر چونکہ یہ اپنے آپ کو بے حد متقی اور پرہیزگار سمجھتے ہیں۔ اس لئے ان میں بے حد تکبر اور نخوت پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ ساری دنیا سے خفا رہتے اور دوسروں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، کیونکہ وہ ان کی نگاہ میں فاسق و فاجر، جہنم کے کندے ہوتے ہیں۔ اس سے عجیب قسم کی مخلوق بن جاتے ہیں جن میں نہ زندگی کی لطافت ہوتی ہے، نہ انسانیت کی لچک۔ بیوروکریٹک کی طرح ان کی بھی اپنی الگ برادری ہوتی ہے۔ جس طرح ان کے ہاں (D. F. A) اور (P. U. C) کے سوا کوئی موضوعِ گفتگو نہیں ہوتا، ان کے ہاں بھی ساری زندگی "مکروہ اور مباح" کی بحثوں میں سمٹ اور سمٹا کر رہ جاتی ہے۔ اور ان کے فتوؤں میں انسانی زندگی کہیں بار نہیں پاتی۔ یہ انسان نہیں، قرآن کے الفاظ میں "خشب مسندہ" بن کر رہ جاتے ہیں۔

———— (٠) ————

مذہب کی بات چھڑی تو معاملہ دُور تک جا پہنچا۔ قرآنِ کریم نے بھی قواعد و ضوابط اور احکام و قوانین دیئے ہیں، اور ان کی پابندی ضروری قرار دی ہے۔ ان احکام و قوانین کی رُو سے معاشرہ میں نظامِ عدل قائم ہوتا ہے، اور نظامِ عدل کو قرآن نے بڑی اہمیت دی ہے۔

نظامِ عدل

.... لیکن قرآنی نظامِ عدل اور بیوروکریسی کے نظامِ عدل میں بنیادی فرق ہے۔ اور وہ فرق یہ ہے کہ بیوروکریٹک نظام میں نہ مجرموں کو انسان سمجھا جاتا ہے، نہ جج کے سینے میں دھڑکنے والا دل ہوتا ہے۔ اس میں ضابطۂ قوانین کی حیثیت اور کیفیت اس پمفلٹ کی سی ہوتی ہے جس میں مشین کی تفصیلات درج ہوتی ہیں۔ جج اس

مشین کا اپریٹر ہوتا ہے جو آنکھیں بند کر کے اس کی ہتھی گھما دیتا ہے۔ اس میں انسانی (CONSIDERATION) کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یہ بات دو ایک مثالوں سے واضح ہو جائے گی۔ ایک کا تعلق قانونِ شریعت سے ہے، دوسری کا ملکی قانون سے۔

فتویٰ

ایک شخص غصے سے مغلوب ہو کر اپنی بیوی کو طلاق۔ طلاق۔ طلاق کہہ دیتا ہے۔ غصہ فرو ہونے پر وہ اپنی حماقت پر نادم ہوتا ہے اور مفتی صاحب سے پوچھتا ہے کہ اس غلطی کے ازالے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ وہ فرماتے ہیں کہ شریعتِ حقہ کی رُو سے اس کی ایک ہی صورت ہے۔ اور وہ یہ کہ تمہاری بیوی کسی اور شخص سے نکاح کرے۔ ایک رات کی "شب باشی" کے بعد وہ اسے طلاق دے دے اور اس کے بعد تم اس سے دوبارہ نکاح کرو۔

یہ سُن کر پانچ چھ بچوں کی ماں، پچاس سالہ بڑھیا پر قیامت گذر جاتی ہے۔ وہ اس قسم کی بے غیرتی کا تصور تک نہیں کر سکتی۔ وہ روتی ہے، بلبلاتی ہے اور مفتی صاحب سے کہتی ہے کہ غلطی اور حماقت تو اس کے خاوند نے کی اور اس کی اس قدر شرمناک سزا اسے دی جا رہی ہے۔ کس جرم کی پاداش میں؟ مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔ فقہ میں ایسا ہی کہا گیا ہے۔ شریعت کا یہی حکم ہے۔ میں اس میں تبدیلی نہیں کر سکتا۔

قطعِ نظر اس کے کہ یہ شرعی حکم بھی ان حضرات کا خود ساختہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس شریعت میں اس قسم کی مظلوموں کی غیرت و حمیت کی کوئی گنجائش نہیں؟ یہ عفت مآب، انسان نہیں مشین ہے! مفتی صاحب ان سوالات کا جواب دینے کے لئے اپنے آپ کو مکلف نہیں پاتے۔ وہ فتوے صادر فرما دیتے ہیں اور مطمئن ہو جاتے ہیں کہ انہوں نے شریعتِ حقہ کا تقاضا پورا کر دیا۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذَالِکَ!

سزا کس کو ملی؟

(۲) مجسٹریٹ نے چوری کے مجرم کو چھ ماہ کی قید کا حکم سنا دیا۔ ضابطہ تعزیرات کی رُو سے یہ بالکل ٹھیک تھا۔ یہ مجرم، اپنے بیوی بچوں اور بوڑھے ماں باپ کا واحد کفیل تھا۔ قانون نے اپنا تقاضا پورا کر لیا لیکن کسی نے یہ نہ دیکھا کہ چھ ماہ تک اتنے بڑے غریب خاندان کی روٹی کا کیا ہوگا! مجرم کو تو اپنے جرم کی سزا ملی، لیکن اس خاندان کو کس جرم کی پاداش میں یہ سزا ملی؟ ——— اور سزا بھی ایسی جو مجرم کی سزا سے بھی زیادہ سخت ہے۔ مجرم کو جیل خانہ میں التزاماً روٹی ملتی رہے گی لیکن اس خاندان کی روٹی کی ذمہ داری کسی کے سر پر نہیں ہوگی! قانون اور عدالت کی نگاہوں میں یہ انسان ہیں ہی نہیں! مجرم کے بچے بھوک سے مر جائیں گے تو اس سے اس مجسٹریٹ (یا واضعین قانون) کے دل میں نہ کوئی کھٹک پیدا ہوگی، نہ ان سے کسی قسم کی باز پُرس ہوگی!

قرآنی نظامِ عدل

قرآنی نظامِ عدل میں، انسانی پہلو کو مقدم رکھا گیا ہے۔ اس نظام کا مقصد فرد اور معاشرہ کی اصلاح ہے، اس لئے قوانینِ خداوندی میں بھی اسی پہلو کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے اور ان قوانین کے اطلاق میں بھی اسی پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ یعنی اس میں جج صاحبان

کا فریضہ یہ نہیں ہوتا کہ ان قوانین کو مشین کی طرح نافذ کر دیا جائے۔ ان کا فریضہ یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ قانون کی مذکورہ بالا غرض و غایت کس طرح پوری ہوتی ہے۔ یعنی قانون اُس غرض و غایت کے حصول کا ایک ذریعہ ہوتا ہے۔ ہم پہلے دو ایک مثالیں اس امر کی پیش کریں گے کہ قانون سازی کے سلسلہ میں انسانی پہلوؤں کی کس قدر رعایت رکھی گئی ہے، اور اس کے بعد یہ بتائیں گے کہ قرآن کے تعزیراتی قوانین کے اطلاق میں اس پر کس قدر زور دیا گیا ہے۔ پہلے قانون سازی کا گوشہ لیجئے۔

قرآنی قوانین

(۱) تاریخِ اجراء سے پہلے

قرآن کا پہلا اصول یہ ہے کہ قانون کا اطلاق اس کی تاریخِ اجراء سے ہوگا۔ اس سے پہلے جو کچھ ہو چکا، ہو چکا۔ اس پر کوئی گرفت نہیں کی جا سکتی۔ اس نے جہاں بھی کسی نئے قانون کا تعین کیا ہے، ساتھ ہی کہہ دیا ہے: اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ (۴/۲۳؛ ۸/۳۸؛ ۲/۲۷۵) "پہلے جو ہو چکا، ہو چکا"۔ سوچیے کہ اس سے افرادِ معاشرہ کو کس قدر اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

(۲) قانون سے عدمِ واقفیت

سیکولر قانون یہ ہے کہ قانون سے ناواقفیت، اس کی خلاف ورزی کی وجہِ جواز نہیں ہو سکتی۔ مجرم قانون سے واقف ہو یا نہ، اسے بہرحال سزا مل کر رہے گی۔ قرآنِ کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ جو خلاف ورزی قانون سے ناواقفیت کی بنا پر سرزد ہو، وہ قابلِ معافی ہے۔ افرادِ معاشرہ کو قانون سے آگاہ کرنا، حکومت کی ذمہ داری ہے۔ اگر حکومت اپنی اس ذمہ داری کے پورا کرنے میں قاصر رہتی ہے تو اس کی سزا افرادِ معاشرہ کو کیوں ملے؟ (۶/۵۴؛ ۱۶/۱۱۹)۔

(۳) ارتکابِ جرم میں دل کا ارادہ شامل ہو

اگلا اصول یہ ہے کہ ارتکابِ جرم میں دل کا ارادہ شامل ہو، وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ (۲/۲۲۵؛ ۳۳/۵) اس سے دیکھئے کہ مقدمہ کا فیصلہ کرنے والے جج پر کس قدر ذمہ داری عائد ہوتی ہے؛ وہ کسی مشین کی نقل و حرکت کا فیصلہ نہیں کر رہا۔ انسانوں کے عمل و اقدام کا جائزہ لے رہا ہے۔ اس کے لئے احوال و کوائف اور نفسیاتِ انسانی کی جن گہرائیوں تک جانے کی ضرورت ہوگی، وہ ظاہر ہے۔

(۴) اضطراری حالت

قرآنِ کریم نے جہاں کھانے پینے کی چند ایک چیزوں کو حرام قرار دیا ہے، وہاں ساتھ ہی یہ بھی

کہ دیا ہے کہ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ط ...... ۵ (۲/۱۷۳) یعنی اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ کھانے کے لئے اور کچھ نہ ملے اور تم (جان بچانے کے لئے) مجبور ہو جاؤ، تو ایسی حالت میں ان چیزوں کو بھی کھا سکتے ہو جنہیں حرام قرار دیا گیا ہے، بشرطیکہ تم واقعی مجبور ہو جاؤ اور تمہاری نیت قانون شکنی اور یا ہوس پرستی کی نہ ہو۔

قرآن کریم نے یہ استثنا، بہ نص صریح کھانے پینے کی چیزوں کے ضمن میں روا رکھی ہے لیکن بعض دیگر حالات میں بھی اضطراری حالت پیدا ہو سکتی ہے۔ مثلاً حفاظت خود اختیاری کے لئے کسی کو قتل کر دینا۔ جج صاحبان کے لئے یہ متعین کرنا بھی ضروری ہو گا کہ ایسا عمل اضطراراً کیا گیا ہے۔ اس کے لئے بھی گہرے غور و تدبر اور انسانی پہلوؤں کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہو گی۔

واضح رہے کہ یہ اضطراری گنجائش ہر تقاضے کے لئے نہیں ہے۔ مثلاً اس نے بھوک پیاس کی صورت میں تو اضطرار کو تسلیم کیا ہے، ..... جنسی تقاضوں میں اسے تسلیم نہیں کیا۔ اس کے برعکس اس نے کہا ہے کہ اگر جائز طریق سے جنسی تقاضے کی تسکین کی صورت نہ ہو، تو ضبط نفس سے کام لیا جائے۔ (۲۴/۳۳)۔ لہٰذا، اضطرار کوئی ایسی گنجائش نہیں کہ جہاں جی چاہے اس سے فائدہ اٹھا لیا جائے اور اس طرح ہر ناجائز کام کو جائز قرار دے دیا جائے۔ فیصلہ کرنے والی اتھارٹی کو اس باب میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہو گی۔

———— (-) ————

اب آیئے تعزیرات کی طرف۔ اس نے کہا ہے کہ جس شخص کے خلاف کسی جرم کے ارتکاب کا الزام عائد کیا جائے، اس کے خلاف پہلا ردِ عمل یہ ہونا چاہیئے کہ ہو سکتا ہے یہ الزام جھوٹا ہو۔ یعنی پہلا ردِ عمل اسے مجرم تصور کر لینے کا نہیں، بلکہ محض ملزم تصور کرنے کا ہونا چاہیئے۔ سورۂ النور میں، جہاں اس واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے جسے عام طور پر واقعہ اِفک کہا جاتا ہے (اور جہالت یا سازش کے تحت، حضرت عائشہ رضؓ کو اس میں ملوث قرار دیا جاتا ہے) وہاں دو بار سختی سے کہہ دیا کہ جب فتنہ پردازوں نے اس فتنہ کو ہوا دی تھی تو تمہیں بلا ساختہ کہہ دینا چاہیئے تھا کہ هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ. (۲۴/۱۲) ...... ۵ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ. ۵ (۲۴/۱۶)۔ یہ محض تہمت تراشی ہے۔ یہ بہتان ہے —

آپ غور کیجئے کہ اس سے ملزم اور معاشرہ پر کیسا خوشگوار اثر پڑتا ہے۔ ہمارے ہاں کے سیکولر نظام میں، جو کچھ "ملزموں" کے ساتھ ہوتا ہے (یعنی جنہیں محض شبہ کی بنا پر شامل تفتیش کر لیا جاتا ہے۔ اور آگے چل کر ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ بے گناہ ہیں) کہ اکثر اوقات وہ اس اذیت سے بچنے کے لئے یا تو جھوٹا اقبالِ جرم کر لیتے ہیں اور یا (بعض اوقات) خودکشی تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔

معاشرہ، انتظامیہ اور عدالت کی طرف سے اس ردِ عمل (یعنی ملزم کو بے گناہ سمجھنے) کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ملزم کی عزت نفس کو ٹھیس نہیں لگتی۔ قرآنی نظام کی غایت، احترام آدمیت کا برقرار رکھنا ہے۔ ملزم تو ایک طرف، وہ تو مجرم کو بھی نفرت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا! بلکہ اس کی لغزش پر اس سے اظہار ہمدردی

کرتا ہے۔ مجرموں کی تباہی پر، خود خدا بے ساختہ پکار اٹھتا ہے کہ یٰحَسۡرَۃً عَلَی الۡعِبَادِ ۔۔۵ (۳۶/۳۰) "اومیرے بندو! کس قدر تاسف انگیز اور حسرت ناک ہے تمہاری یہ حالت!" وہ جرم سے نفرت کی تلقین کرتا ہے، مجرم سے نہیں۔ اور ان دونوں میں فرق کرنا عمیق بصیرت چاہتا ہے۔ قرآنی نظامِ عدل کا یہی تقاضا ہے۔ بعض جرائم ایسے شنیع ہوتے ہیں کہ ان سے مستغیث کے دل میں غصے کے جذبات ابھر آتے ہیں۔ قرآن کریم مومنین کی صفات یہ بھی بتاتا ہے کہ وہ ایسی حالت میں بھی عفو اور درگذری سے کام لیتے ہیں۔ (۴۲/۳۷) حضرت عمرؓ نے اسی بنا پر کہا تھا کہ کسی کے صحیح کردار کا معلوم کرنا ہو تو اسے غصے کی حالت میں پرکھنا چاہیئے۔

(۰)

معافی

اب ہمارے سامنے وہ مقام آتا ہے جہاں قرآنی نظام، دنیا کے ہر نظامِ عدل سے منفرد نظر آتا ہے۔ (جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے) قرآنی نظامِ عدل کی غایت افراد اور معاشرہ کی اصلاح ہے۔ وہ اسے ترجیح دیتا ہے کہ یہ مقصد بغیر سزا کے حاصل ہو جائے۔ اور سزا وہیں دیتا ہے جہاں ایسا کرنا ناگزیر ہو۔ اثباتِ جرم کے بعد معاف کر دینے کو عام طور پر رحم (MERCY) کہا جاتا ہے، اور چونکہ عدل اور رحم متضاد عناصر ہیں، اس لئے رحم کو نظامِ عدل کا جزو نہیں قرار دیا جاتا۔ اسے "ترحم خسروانہ" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ میں آگے چل کر اس کی وضاحت کروں گا کہ یہ تمام تصورات غیر قرآنی ہیں۔ قرآن میں اس قسم کے رحم کا تصور نہیں۔ سردست میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ قرآنی نظامِ عدل میں سزا اور معافی دونوں کو ہمکنار رکھا گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اِعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ شَدِیۡدُ الۡعِقَابِ وَ اَنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ؕ۵ (۵/۹۸) "اسے اچھی طرح سمجھ رکھو کہ خدا مجرموں کا مواخذہ کرنے میں بڑا سخت گیر ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی معاف کر دینے میں بھی بڑا وسیع الظرف ہے۔"

آگے بڑھنے سے پہلے، دو ایک اہم نکات کا سمجھ لینا ضروری ہے۔

(۱) قرآن کریم نے خدا کی جن صفات کا ذکر کیا ہے اُن سے مقصود یہ ہے کہ مومنین میں (علیٰ حدِ بشریت) ان صفات کا منعکس ہونا ضروری ہے۔ اور اس کی محسوس اور مرئی شکل یہ ہے کہ ان کا نظام، ان صفات کا مظہر ہو۔ یعنی اس نے جب کہا ہے کہ خدا شدید العقاب بھی ہے اور غفور رحیم بھی، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی نظام کو ان ہر دو خصائص کا حامل ہونا چاہیئے۔ یعنی مجرمین کی گرفت کرنے والا بھی اور معاف کر دینے والا بھی۔

(۲) چونکہ ہمارے مروجہ اسلام کے تصورات اور مسالک دورِ ملوکیت کے وضع کردہ ہیں، اس لئے اس معاشرہ میں، صفاتِ خداوندی کے انعکاس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ استبداد ملوکیت کے حامل معاشرہ میں "خدا" کا کیا کام؟

اس سے، سوال پیدا ہوا کہ قرآن میں جو صفاتِ خداوندی کا اس قدر ذکر ہے تو اس کا مطلب اور مقصد کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ ان صفات کا ظہور آخرت میں ہوگا۔ خدا کافروں کو جہنم رسید کرے گا اور مسلمانوں کے گناہ بخش کر انہیں جنت میں داخل کر دے گا۔ "بخش دینے" کی اصطلاح قابلِ غور ہے۔ کیونکہ اس کے گرد ہمارے تصورِ مکافاتِ عمل کی ساری عمارت گردش کرتی ہے۔ "بخشش" کا لفظ تو آپ نے سنا ہوگا۔ یعنی جو چیز بطورِ استحقاق (AS OF RIGHT) نہ ملے۔ بطورِ خیرات ملے۔ اس سے خدا کے بخش دینے کا تصور قائم ہوا۔ یعنی اعمال کے لحاظ سے تو ہم جہنم کے مستوجب ہوں گے لیکن خدا ہمارے گناہ "بخش دے گا" اور اس طرح ہمیں جنت بطورِ خیرات مل جائے گی۔ اقبالؒ کے الفاظ میں :-

مغفرت کے معنی

بہشتے بہرِ پاکانِ حرم است — بہشتے بہرِ اربابِ ہمم است!
بگو ہندی مسلماں را کہ خوش باش! — بہشتے "فی سبیل اللہ" ہم است (ارمغانِ حجاز)

اور یہیں سے مغفرت کا ترجمہ "بخشش" اور غفور کا ترجمہ "بخشنے والا" کر دیا گیا۔

تاریخ کے اوّلیں دَور سے آج تک، بادشاہوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو اختیارات و اقتدارِ خداوندی کا حامل سمجھا اور منوایا ہے۔ ہندوؤں کے راجے ایشور کے اوتار تھے۔ عیسائیوں کے شاہنشاہ، حقوقِ خداوندی (DIVINE RIGHTS) کے علمبردار۔ مسلمانوں کے سلاطین، ظل اللہ علی الارض (زمین پر خدا کا سایہ)۔ ان اختیارات کی رُو سے، مملکت کی ہر شے، بادشاہ کی ملکیت ہوتی تھی اور رعایا کو جو کچھ ملتا تھا، اس کی طرف سے "بخشش" کے طور پر ملتا تھا۔ انسان کی سب سے قیمتی متاع، اس کی جان ہوتی ہے۔ سلاطین کے اس منصب کی رُو سے، افراد کی جان بھی، ان کی ملک ہوتی تھی اور افراد کے پاس ان کی طرف سے بخشیدہ۔

قرآن میں بیان کردہ داستانِ حضرت ابراہیمؑ میں جب انہوں نے بادشاہ سے کہا کہ میرا خدا وہ ہے جس کے ہاتھ میں موت اور زندگی ہے، تو اس نے کہا تھا کہ اَنَا اُحْیٖ وَ اُمِیْتُ ...... (۲/۲۵۸) نہیں! افراد کی موت اور حیات میرے ہاتھ میں ہے۔ چنانچہ وہ جسے چاہتا...... موت کی سزا دے دیتا۔ پھر مجرم اس کے حضور روتا چیختا۔ گڑگڑاتا، نہ صرف ہاتھ جوڑتا بلکہ سجدے بھی کرتا اور انتہائی عجز و لجاجت سے کہتا...... کہ حضور میری جان بخشی کر دیجئے۔ اور اس کا ایک اشارۂ ابرو، اس کی "جان بخش دیتا"۔ اس سے درحقیقت تذلیلِ انسانیت مقصود تھی۔ بادشاہ اپنے مخالفین کو ذلیل کرنا چاہتا تھا۔ یہ حقوق ہر دَور کے شہنشاہوں نے اپنے لئے مخصوص رکھے۔ حتیٰ کہ آج کی مہذب دنیا میں بھی، جہاں دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ ملوکیت کا خاتمہ ہو چکا ہے، تمام دنیا کے دساتیر (CONSTITUTIONS) میں سزائے موت پانے والے مجرموں کی "رحم کی درخواست" منظور یا مسترد کرنے کا اختیار سربراہِ مملکت کو حاصل ہوتا ہے۔ یہ وہی نمرود کے تمرد کی صدائے بازگشت ہے۔ وہی روحِ ملوکیت ہے جو آئینی پردوں میں رقصاں ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں :-

ترحّمِ خسروانہ!

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام　　جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

اس "ترحم خسروانہ" سے جان تو بخشش میں مل جاتی ہے لیکن انسانیت کی جس قدر تذلیل ہوتی ہے اس کا اندازہ ہر قلبِ حساس کرسکتا ہے۔ ایک انسان کا اپنے جیسے انسان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہونا اور منتیں کرنا کہ حضور! میری جاں بخشی کر دیجئے، اس سے بڑھ کر ایک طرف کبر و تمرد اور دوسری طرف تذلیلِ انسانیت اور کیا ہو گی۔ چنانچہ ہمیں تاریخ میں ایسے "غیور مجرموں" کے نام جلی حروف میں لکھے ملتے ہیں جنہوں نے جلاد کی تلوار یا پھانسی کے تختے کو قبول کر لیا لیکن اپنے ہی جیسے انسان (سربراہِ مملکت) سے جان کی بھیک مانگنا گوارا نہ کیا۔

قرآن کریم نے تذلیلِ انسانیت کی اس رسمِ کہن کا خاتمہ کر دیا اور سزا سے معافی کو، کسی حاکمِ اعلیٰ کی خیرات کی جگہ، خود قانونِ تعزیرات کا جزو بنا دیا۔ یہ بہت بڑا انقلاب تھا جس سے قرآن نے دنیائے انسانیت کو آشنا کرایا۔ آپ کو قرآنِ کریم میں ہر جرم کی سزا کے بعد "اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ" لکھا ملے گا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ قوانینِ خداوندی، شَدِیْدُ الْعِقَاب (سخت مؤاخذہ) اور غفورٌ رّحیم (معافی) دونوں سے مرکب ہیں۔

غفورٌ رّحیم

واضح رہے کہ مغفرت کے معنی "بخشش" نہیں۔ اس کے معنی حفاظت ہیں۔ اور غفور کے معنی "بخشنے والا" نہیں، بلکہ حفاظت کرنے والا ہیں۔ ظاہر ہے کہ قانون کی خلاف ورزی سے معاشرہ میں کچھ نقصان ہوتا ہے، اور خود مجرم کی ذات کا زیاں بھی۔ قرآنی قانون میں اس نقصان کی تلافی کی گنجائش (PROVISION) رکھ دی گئی اور اس طرح معاشرہ اور اس فرد کو جو نقصان پہنچا تھا، اس کی حفاظت کا سامان بہم پہنچا دیا۔

رحیم کے معنی "رحم کرنے والا" نہیں۔ اس کے معنی ہیں، سامانِ نشو و نما بہم پہنچانے والا۔ خدا کے غفورٌ رّحیم ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس کے قانونِ مکافات میں اس کی گنجائش رکھ دی گئی ہے کہ.... ارتکابِ جرم سے مجرم کی ذات کا جو نقصان ہوا ہے اسے اس سے محفوظ بھی رکھا جائے اور اس کی انسانی صلاحیتوں کی نشو و نما پانے میں جو کمی رہ گئی تھی (اور جس کی وجہ سے اس سے ارتکابِ جرم سرزد ہوا تھا) اسے بھی دور کر دیا جائے۔

یہ ہے قرآن کی رو سے معافی سے مراد، جس کی گنجائش ہر جرم کی سزا کے قانون میں موجود ہے۔ "قانون کے اندر موجود" ہونے کے معنی یہ ہیں کہ یہ معافی کسی انسان کی طرف سے، خیرات یا بھیک کے طور پر نہیں ملتی۔ مجرم اسے قانونی استحقاق (LEGAL RIGHT) کے طور پر حاصل کرتا ہے۔ اس طرح اس کی عزتِ نفس بھی مجروح نہیں ہوتی۔

معافی کی شرائط

لیکن یہ معافی یونہی نہیں مل جاتی۔ یہ ایک اہم شرط سے مشروط ہے۔ اس کا ارشاد ہے کہ فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (۵/۳۹) جو مجرم، ارتکابِ جرم کے بعد اپنے کئے پر دل سے نادم ہو اور آئندہ کے لئے اپنی اصلاح کا عزم کرے (اور مجاز اتھارٹی اس کا اطمینان کرلے کہ اس

میں اصلاح کا واقعی امکان ہے) تو اسے "مغفرت اور رحمت" کے حق سے نوازا جا سکتا ہے۔ سزا کا مستوجب وہ ہوگا جو جانتے بوجھتے جرم کا ارتکاب کرے اور اپنے جرم پر نادم ہونے کے بجائے اس پر اصرار کرے۔ چنانچہ قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ معافی کا حقدار وہ ہے: وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَىٰ مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ ۝ (۳/۱۳۵) "اسے خلاف ورزیٔ قانون کے نقصانات کا علم و احساس ہو،... اور اس پر اصرار نہ کرے"۔ اس سے یہ بھی واضح ہے کہ قرآن میں جن سزاؤں کا ذکر ہے وہ آخری درجہ پر "عادی مجرموں" کے لئے ہیں۔ یعنی جو بار بار ارتکاب جرم کریں۔

ان تصریحات سے یہ بھی واضح ہے کہ اسلامی نظام میں عدالت کی ذمہ داریاں کس قدر گراں بار ہیں۔ اُسے مشینوں کی طرح قانون کے الفاظ کی پیروی نہیں کرنی ہوتی۔ اسے بہت سے نرم و نازک انسانی گوشوں کا لحاظ بھی رکھنا ہوتا ہے اور قانون کے بہت سے مستور تقاضوں کو پورا بھی کرنا۔

—— (٥) ——

اب آپ قرآنی قوانین کو دیکھئے۔ ان میں سزا اور عفو دونوں یکجا موجود ہیں۔ یعنی سزا سے معافی نہ تو کسی خارجی اتھارٹی کی طرف سے ملتی ہے اور نہ ہی وہ مجرم کو رحم کے طور پر عطا ہوتی ہے۔ یہ خود قانون کا جزو ہوتی ہے اور جو مجرم ان شرائط کو پورا کرتا ہے (یعنی تاب و اصلح کی شرائط کو) وہ ازروئے قانون اس کا حقدار ہو جاتا ہے۔ اس باب میں ہم معمولی لغزشوں سے شروع کر کے سنگین جرائم تک پہنچیں گے۔ آپ دیکھیں گے کہ قرآن کریم کی رُو سے کوئی بھی جرم ایسا نہیں جس میں معافی کی گنجائش نہ ہو یعنی جس میں ارتکاب جرم کے بعد خدا کے "غفور رحیم" ہونے کا ذکر نہ ہو۔

معافی قانون کی رُو سے!

۱۔ عام اصول

سورۃ النساء میں ہے:-

وَمَنْ يَعْمَلْ سُوءًا أَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهُ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللَّهَ يَجِدِ اللَّهَ غَفُورًا رَحِيمًا ۝ (۴/۱۱۰)

جس شخص نے کوئی ایسا کام کیا جس کا تخریبی اثر معاشرہ پر پڑتا ہو، یا خود اس کی اپنی ذات پر، اور پھر وہ اس کے لئے خدا سے حفاظت طلب کرے، تو اس نقصان کی تلافی بھی ہو جائے گی اور اس کی ذات کی نشوونما کا سامان بھی مہیا ہو جائے گا۔

اس اصول مذکرہ میں ہر قسم کا جرم آجاتا ہے، خواہ وہ معاشرہ کے خلاف ہو یا انسان کی اپنی ذات کے خلاف۔

سورۂ نمل میں قصہ حضرت موسیٰؑ کے ضمن میں فرمایا کہ اس شخص کو ڈرنے کی ضرورت نہیں:-

إِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًا بَعْدَ سُوءٍ فَإِنِّي غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝ (۲۷/۱۱)

جو کوئی زیادتی کر بیٹھے لیکن اس کے بعد حسن کارانہ انداز سے (قانون اور قاعدے کے مطابق)

اس کا ازالہ کرے، تو وہ خدا کی طرف سے مغفرت اور رحمت سے نوازا جائے گا۔

سورۂ اعراف میں ہے:۔

وَالَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِهَا وَاٰمَنُوْٓا ۡ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ
بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (۷/۱۵۳)

جن لوگوں سے کوئی لغزش سرزد ہو جائے لیکن اس کے بعد وہ اس سے تائب ہو جائیں اور قانونِ خداوندی کی صداقت پر یقین کر لیں، تو وہ خدا کو غفور و رحیم پائیں گے۔

اس آیۂ جلیلہ میں، تَابُوْا کے بعد اٰمَنُوْا، بڑا معنی خیز ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی شخص قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کرتا ہے، تو اس وقت درحقیقت، اس قانون کی محکمیت اور مکافاتِ عمل پر اس کا ایمان نہیں ہوتا۔ اگر اسے اس کا یقین ہو تو اس سے ارتکابِ جرم سرزد ہی نہ ہو۔ معاشرہ سے جرائم کے انسداد، یا کم از کم اصلاح کے لئے یہ بڑا مؤثر طریق ہے۔ یعنی افرادِ معاشرہ کے دل میں قانون کے احترام اور اس کی خلاف ورزی کے نقصانات پر علیٰ وجہ البصیرت یقین (ایمان) کو پختہ سے پختہ تر کیا جائے۔ اور یہ عمل مسلسل اور متواتر جاری رہے۔ یہ مقصد قانون کی پابندی کے خوشگوار نتائج کو محسوس شکل میں سامنے لانے سے حاصل ہوگا۔

سورۂ احزاب میں اس اصولِ مغفرت (معافی) کو ہمہ گیر بتایا گیا ہے، فرمایا:۔

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ
اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ (۳۹/۵۳)

(اے رسول!) میرے ان بندوں سے، جو اپنے آپ پر زیادتی کر بیٹھے ہوں، کہہ دے کہ وہ خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ تمام لغزشوں کے نقصانات کی تلافی کا انتظام کر دے گا۔ وہ بڑا غفور و رحیم ہے۔

اس کا طریق یہ ہے کہ

وَاَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا
تُنْصَرُوْنَ ۝ (۳۹/۵۴)

وہ فوراً قانونِ خداوندی کی طرف رجوع کریں اور اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں، قبل اس کے کہ سزا ان پر وارد ہو جائے۔ اس صورت میں ان کی کوئی مدد نہیں کر سکے گا۔

خدا کی طرف رجوع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ

وَاتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ
بَغْتَةً وَّاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝ۙ (۳۹/۵۵)

جو کچھ خدا نے تمہاری طرف نازل کیا ہے (یعنی قرآن کریم) اس کا بطریقِ احسن اتباع کرو قبل اس کے کہ تم اپنے دل میں مطمئن ہو رہو کہ مجھ سے کون مؤاخذہ کر سکتا ہے، اور خدا کا قانون

تمہاری گرفت کرلے۔

(ضمناً) آیت (۳۹/۵۳) میں "اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ ...." کہا گیا ہے۔ یعنی مجرم یہ سمجھتا ہے کہ اس نے دوسرے شخص کو نقصان پہنچایا ہے، حالانکہ اس ارتکابِ جرم سے خود اس کی ذات کو نقصان پہنچا ہے۔ فریقِ مقابل کو تو کوئی طبیعی نقصان پہنچا ہوگا۔ اس سے خود اس کی ذات کو جو نقصان پہنچا ہے، وہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ لہٰذا، یہ جرم کسی اور کے خلاف نہیں، خود اس کے اپنے خلاف سرزد ہوا ہے۔ سورۃ النسآء میں ہے: وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ ... (۴/۱۱۱) "جو شخص بھی کوئی جرم کرتا ہے، تو وہ جرم کسی دوسرے کے خلاف نہیں، خود اس کے اپنے خلاف ہوتا ہے۔" اس حقیقت کو اگر افرادِ معاشرہ کے دل میں جاگزیں کر دیا جائے، تو معاشرہ سے جرائم معدوم ہو جائیں۔ اسلام کے صدرِ اوّل کے متعلق جو حقیقت بیان کی جاتی ہے کہ اس میں جرائم معدوم ہو گئے تھے تو اس کی وجہ انتظامیہ (پولیس وغیرہ) کی حسن کارکردگی نہیں تھی۔ اس کی وجہ، افرادِ معاشرہ کی صحیح تعلیم و تربیت سے ان کی ذہنیت کی تبدیلی تھی۔ قانون کی صداقت پر ان کا یقین محکم تھا۔ اس قسم کی نفسیاتی تبدیلی کے بغیر، معاشرہ میں اصلاح ہو ہی نہیں سکتی، (۱۳/۱۱)۔ ڈنڈے کے زور سے، جرائم کا انسداد تو ہو نہیں سکتا۔ اس سے البتہ، انسان حیوانوں کی سطح پر آجاتے ہیں۔

توبہ کا مفہوم

۲۔ توبہ بلا تاخیر

سورۃ الزمر کی آیات (۳۹/۵۴-۵۵) میں جو کہا گیا ہے کہ توبہ، سزا سے پہلے ہونی چاہیئے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ارتکابِ جرم کے بعد، خود مجرم کے خلاف دل میں جذباتِ نفرت کا بیدار ہونا۔ اس سے مجرم کا منفعل ہونا اور آئندہ کے لئے اپنی اصلاح کا عزم کر لینا، اس کا نام توبہ ہے۔ سزا کی عقوبت سے بچنے کے لئے توبہ کو آڑ بنا لینا، توبہ نہیں، توبہ کے لئے دل کی تبدیلی لازمی شرط ہے۔ اس کا احساس ارتکابِ جرم کے فوری بعد ہونا چاہیئے۔ سورۃ النسآء میں ہے:-

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ○ (۴/۱۷)

توبہ اُن کی قابلِ قبول ہوگی جن سے محض نادانی (جہالت) سے کوئی لغزش سرزد ہو جائے اور وہ اس سے بلا تاخیر تائب ہو جائیں۔ یہ ہے خدا کا وہ قانون جو علم اور حکمت پر مبنی ہے۔

ان کے برعکس:-

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّيْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ○ (۴/۱۸)۔

ان کی توبہ، توبہ کہلا ہی نہیں سکتی جو ارتکابِ جرم کرتے رہیں اور جب موت سامنے آ کھڑی ہو تو کہہ دیں "یا اللہ میری توبہ"۔ نہ ہی ان کی جو حالتِ کفر ہی میں وفات پا جائیں۔ یہ الم انگیز عذاب کے مستوجب ہوں گے۔

یہاں یہ حقیقت بھی قابلِ غور ہے کہ آیت (۴/۱۵۱) میں سچی توبہ کو "تجدیدِ ایمان" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور جرم پر اصرار کو کفر سے۔

اس اصولی وضاحت کے بعد، جرائم کی طرف آئیے:۔

(۱) فواحش کی اشاعت

بے حیائی کا ارتکاب تو ایک طرف، قرآن کریم کی رو سے اس کی اشاعت بھی جرم ہے، ارشاد ہے:۔
إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَنْ تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ○ (۲۴/۱۹)۔

جو لوگ چاہتے ہیں کہ جماعتِ مومنین (اسلامی معاشرہ) میں بے حیائی کی باتیں عام کریں انہیں اس دنیا میں بھی الم انگیز سزا ملے گی اور آخرت میں بھی۔ تم نہیں جانتے کہ فواحش کی اشاعت سے بھی معاشرہ کو کس قدر نقصان پہنچ جاتا ہے۔

اللہ کو اس کا علم ہے۔ اس لئے اس نے اسے روکنے کے لئے تاکید کی ہے کہ ایسا پھر نہ کرنا (۲۴/۱۷)
اس کے بعد ہے:۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ وَأَنَّ اللَّهَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ ع (۲۴/۲۰)

جو کچھ تمہارے ہاں اس سلسلہ میں ہوا ہے، اگر اللہ کا فضل شاملِ حال نہ ہوتا تو اس سے بڑا نقصان ہو سکتا تھا۔ یہ خدا کی رافت و رحمت ہے جو تمہیں ایسے نقصانات سے محفوظ رکھتی ہے۔

رقیق القلبی

اس مقام پر خدا کی صفت رافت و رحمت کا خصوصیت سے ذکر کرنے سے مراد یہ ہے کہ ایسے جرائم کا فیصلہ کرنے والے "مشینی انسان" نہیں ہونے چاہئیں۔ ان کے سینے میں نرم و نازک حساس قلب ہونے ہونے چاہئیں۔ حضورؐ کو اس قسم کا قلبِ گداز عطا ہوا تھا جس کا خدا نے خصوصیت سے ذکر کیا ہے:۔

قلبِ گداز

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِنَ اللَّهِ لِنْتَ لَهُمْ ۖ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ..... ○ (۳/۱۵۹)

(اے رسول!) یہ تیرے خدا کی موہبتِ کبریٰ ہے کہ اس نے تمہیں قلبِ گداز عطا فرمایا ہے۔ اگر تم سنگدل اور سخت مزاج ہوتے، اور انسانی کمزوریوں کی رعایت کے لئے تمہارے دل میں نرم گوشہ نہ ہوتا، تو تمہاری جماعت کے افراد ایک ایک کر کے تمہیں چھوڑ جاتے۔ لہٰذا

تم (قانونِ خداوندی کے مطابق) ان کی کوتاہیوں سے درگذر کرو اور ان کے لئے حفاظت کا سامان طلب کرو۔ ان کی لغزشوں کی بنا پر انہیں دھتکارو نہیں بلکہ انہیں اپنے قریب رکھو اور معاملات میں ان سے مشورہ لیا کرو۔ (اس سے ان میں عزتِ نفس اور خود اعتمادی کا احساس اور بھی بڑھ جائے گا۔)

ایسے ہونے چاہئیں محافظانِ آئین اور ناقدانِ قوانین خداوندی! ان کا واسطہ انسانوں سے پڑتا ہے۔ حیوانوں یا پتھر کی چٹانوں سے نہیں! آپ نے غور فرمایا کہ ان سے مشاورت کا حکم دیکر احترامِ آدمیت کا کتنا بڑا ثبوت دیا گیا ہے۔ اقبالؒ نے شاید ایسے ہی مقام کے لئے کہا تھا کہ ؎

نہ بچا بچا کے تو رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

اور یہ نتیجہ تھا سچی توبہ کا۔ (پھر اقبالؒ ہی کے الفاظ میں) ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کےؔ

(۲) ارتکابِ فواحش

پہلے اشاعتِ فواحش کا ذکر تھا۔ اب اس کے ارتکاب کا جرم سامنے آتا ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں ہے:۔

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰي مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ (۳/۱۳۵)

مومنین کی خصوصیات میں یہ بھی ہے کہ اگر ان سے کبھی (سہواً) فواحش کا ارتکاب ہو جائے، تو وہ فوراً قانونِ خداوندی کو اپنے سامنے لے آتے ہیں، اور خدا سے اپنی لغزش کے نقصان کی حفاظت طلب کرتے ہیں۔ یہ سامانِ حفاظت قانونِ خداوندی کی رُو ہی سے مل سکتا ہے۔ وہ اپنی اس لغزش پر اصرار نہیں کرتے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اس طرح خدا کی طرف سے حفاظت نہیں مل سکے گی۔

ہم نے پہلے ... کہا ہے کہ قانونِ خداوندی کی رُو سے مجرم کو جو معافی ملتی ہے تو یہ رحم (MERCY) کے طور پر، خیرات نہیں ہوتی۔ اس سے تو انسانیت کی تذلیل ہو جاتی ہے۔ وہ اسے قانونی گنجائش کے طور پر بطورِ استحقاق حاصل کرتے ہیں۔ قرآن کے الفاظ میں: اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ ...... ۝ (۳/۱۳۶) یہ ان کے حسنِ عمل کا بدلہ ہوتا ہے۔ یہ ان کے عرقِ انفعال کے موتیوں کی قیمت ہوتی ہے جو انہیں ادا کی جاتی ہے۔

آپ غور فرمایئے کہ قرآنِ کریم، کس طرح قدم قدم پر، اس حقیقت کو ابھار کر سامنے لاتا ہے کہ

ؔ کس قدر سچ کہا ہے کسی نے کہ ؎

ہیرا ابھی ہے دل تو بھجز ہے یوں قدر نہیں کچھ ہوتی ہے
ہاں پانی ہو کر بہ نکلے پھر جو قطرہ ہے موتی ہے

انسان اپنی کسی لغزش (جرم) کی وجہ سے احترامِ آدمیت سے محروم نہیں ہو جاتا۔ قرآن کریم میں "آدم و ابلیس" کا تمثیلی بیان، اسی حقیقت کا ترجمان ہے۔ آدم سے بھی لغزش ہوئی اور ابلیس سے بھی۔ آدم سے پوچھا گیا کہ تم نے ایسا کیوں کیا، تو اس نے جھکے ہوئے سر، اور شرم آلود نگاہوں سے کہا کہ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ٥ (۷/۲۳) "اے ہمارے رب! ہم سے غلطی ہوئی۔ ہم بھول گئے۔ ہم نے اپنے آپ پر ظلم کیا، اگر تو ہمیں سامانِ مغفرت و رحمت عطا نہیں کرے گا تو ہم تباہ ہو جائیں گے۔" ان کی توبہ قبول ہو گئی۔ ابلیس سے پوچھا تو..... اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ٥ (۲/۳۴) اس نے سرکشی اختیار کی۔ اکڑ کر سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس نے قانون کے احترام اور اطاعت سے انکار کر دیا۔ تو وہ راندۂ درگاہ ہو گیا۔

یہ ہے اصل الاصول قرآنی معاشرہ میں نظامِ عدل کا۔

۳۔ ایذا رسانی

سورۂ البروج میں ہے:۔

اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ ٥ (۸۵/۱۰)

جو لوگ، مومن مردوں اور عورتوں کو ایذا پہنچاتے ہیں، وہ اگر توبہ نہ کریں تو انہیں سوزناک عذاب دیا جائے گا۔

ایذا رسانی میں طبیعی ایذا اور نفسیاتی ایذا، دونوں شامل ہیں۔ یعنی تذلیل و تضحیک، جسے عرفِ عام میں ازالۂ حیثیتِ عرفی کہا جاتا ہے۔ اس میں بھی معافی (توبہ) کی گنجائش موجود ہے۔

۴۔ سرقہ

جرمِ سرقہ کی سزا کے متعلق ارشاد ہے:۔

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ٥ (۵/۳۸)

سارق مرد اور سارق عورت کے جرم کی سزا یہ ہے کہ ان کے ہاتھ قطع کر دیئے جائیں۔ یہ خدائے عزیز و حکیم کی طرف سے عائد کردہ روک تھام ہے۔

چونکہ زیرِ نظر موضوع کا تعلق صرف اس نکتہ سے ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے ہر جرم میں معافی کی گنجائش رکھی گئی ہے، اس لئے میں "سرقہ" کی تفصیل اور قطعِ ید کے مفہوم کی وضاحت سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اپنے آپ کو موضوع تک محدود رکھنا چاہتا ہوں۔ مندرجہ بالا آیت سے ملحق اگلی آیت میں ہے:۔

فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ٥ (۵/۳۹)

دیکھئے! اس میں ارتکابِ جرم (ظلم) کے بعد تائب اور اَصلَحَ ہونے کا کہا گیا ہے۔ سزا مل چکنے کے بعد نہیں۔ قطعِ ید کی سزا مل جانے کے بعد معافی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خدا کی غفورٌ رحیمی، تو سزا سے معافی کا نام ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے، یہ سزا بھی عادی مجرموں کے لئے ہے، جو نہ اپنے جرم پر نادم ہوں، نہ اصلاح کا ارادہ رکھتے ہوں۔ بلکہ..... بار بار ارتکابِ جرم کریں۔ ($\frac{۳}{۳۴}$)

۵۔ قذف (تہمت تراشی)

جرمِ قذف کی سزا اسّی کوڑے ہے ($\frac{۲۴}{۴}$) لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی مذکور ہے کہ

اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِکَ وَاَصْلَحُوْا ۚ فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ ($\frac{۲۴}{۵}$)

(لیکن) جو لوگ ارتکابِ جرم کے بعد تائب ہوں اور اپنی اصلاح کر لیں، تو وہ قانونِ خداوندی کی رُو سے معافی کے مستحق ہوں گے۔

۶۔ مستورات سے چھیڑ چھاڑ

قرآن کریم نے عفت مآب مستورات سے چھیڑ چھاڑ کو سنگین جرم قرار دیا ہے اور اس کی سخت ترین سزا مقرر کی ہے۔ ہجرتِ نبویؐ کے بعد، مدینہ کی ابتدائی زندگی میں شر انگیز عناصر کی کثرت تھی۔ مسلمان خواتین باہر نکلتیں تو وہ لوگ ان سے چھیڑ چھاڑ کرتے۔ پوچھنے پر کہہ دیتے کہ ہم نے سمجھا تھا کہ یہ بازاری عورتیں ہیں۔ ان کے اتمامِ حجت کے لئے، مسلمان عورتوں سے کہا گیا کہ وہ باہر نکلیں تو اپنے لباس کے اوپر ایک "اوور آل" سا اوڑھ لیا کریں تاکہ ان میں اور بازاری عورتوں میں تمیز ہو سکے۔ اس کے بعد فرمایا:

لَئِنْ لَّمْ یَنْتَہِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِہِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِی الْمَدِیْنَۃِ لَنُغْرِیَنَّکَ بِہِمْ ثُمَّ لَا یُجَاوِرُوْنَکَ فِیْہَآ اِلَّا قَلِیْلًا ۝ مَّلْعُوْنِیْنَ ۚ اَیْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِیْلًا ۝ ($\frac{۳۳}{۶۱-۶۰}$)

(اگر اس کے باوجود) منافقین اور شر انگیز عناصر اور جھوٹی خبریں پھیلانے والے، اپنی خباثتوں سے باز نہ آئیں تو ان کے خلاف قوت سے کام لینا پڑے گا۔ اس سے یہ لوگ (رفتہ رفتہ) یہاں سے خود ہی چلے جائیں گے۔ اگر ایسا نہ ہو تو انہیں تمام حقوقِ شہریت سے محروم کر دیا جائے گا۔ اگر پھر اس پر بھی اپنی شرارتوں سے باز نہ آئیں تو جہاں کہیں بھی ہوں انہیں گرفتار کیا جائے اور شدت کے ساتھ قتل کیا جائے۔

غور کیجئے! ایسا سنگین جرم اور اس کی ایسی شدید سزا، لیکن اس کے لئے بھی کہا گیا کہ انہیں پہلے وارن کیا جائے۔ اگر یہ اس پر بھی باز نہ آئیں، تو پھر سزا کے اقدامات کئے جائیں۔ مقصد تو معاشرہ میں قیام امن ہے۔ اگر یہ مقصد سزا کے بغیر حاصل ہو جائے تو ہوا المراد۔ ایسا نہ ہو تو پھر دار و گیر کے لئے قدم اٹھایا جائے۔

۷۔ جرمِ زنا

قرآنِ کریم کی رُو سے جرمِ زنا کی سزا (عورت اور مرد دونوں کو) سو کوڑے ہے۔ (۲۴/۲) یہ چوبیسویں سورۃ ہے۔ اس سے اگلی (پچیسویں) سورۃ میں مومنین کی خصوصیات کے سلسلہ میں کہا گیا ہے:۔

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِىْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ۙ يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ۖ (۲۵/۶۸-۶۹)

یہ وہ لوگ ہیں جو خدا کے اقتدار کے ساتھ کسی اور کا اقتدار تسلیم نہیں کرتے۔ اور انسانی زندگی کو جسے خدا نے واجب الاحترام قرار دیا ہے، تلف نہیں کرتے بجز اس کے کہ انہیں حق و انصاف کی خاطر ایسا کرنا پڑے۔ نہ ہی یہ لوگ زنا کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ایسا کرنا جرم ہے۔

ان جرائم کی سزا اس دنیا میں بھی ملتی ہے اور قیامت میں اس سے بھی زیادہ۔ یہ لوگ ذلت و خواری کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

اس کے بعد ہے:۔

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ○ (۲۵/۷۰)

لیکن جو مجرم، تائب ہو جائے، قانون کے احترام کا سچے دل سے یقین کرے، صلاحیت بخش کام کرے، تو خدا کا قانون اس کی سابقہ غلط روش کے نتائج کو حسنات سے بدل دے گا۔ اللہ غفور و رحیم ہے۔

اس میں جرمِ قتل اور جرمِ زنا، دونوں کو قابلِ معافی قرار دیا گیا ہے۔ بلکہ اصولاً یہاں تک کہہ دیا ہے کہ

وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ○ (۲۵/۷۱)

(خدا کا قانون یہ ہے کہ) جو شخص بھی اپنی کسی غلط روش کو چھوڑ کر صلاحیت بخش کام کرتا ہے اس کا ہر قدم قانونِ خداوندی کی طرف اٹھتا ہے۔ (اس کی زندگی اس کے مطابق ہو جاتی ہے)۔

یعنی سابقہ غلط روش کا کوئی داغ اس کے دامنِ زندگی پر باقی نہیں رہتا۔ اس کے سب دھبے دُھل جاتے ہیں۔

۸۔ لواطت یا سحاقت

سورۃ النساء میں ہے:۔

وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ ...... ○ (۴/۱۶)

اگر دو مرد (یا دو عورتیں) بے حیائی کے جرم کی مرتکب ہوں تو انہیں مناسب سزا دو۔

اس سے عام طور پر لواطت یا سحاقت دونوں جرم مراد لئے جاتے ہیں۔

جتنا حصہ اوپر درج کیا گیا ہے وہ اس آیت کا حصۂ اوّل ہے۔ بقایا آیت یوں ہے:۔

فَإِنْ تَابَا وَأَصْلَحَا فَأَعْرِضُوا عَنْهُمَا ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ تَوَّابًا رَحِيمًا ○ (۴/۱۶)

لیکن اگر وہ اپنے کئے پر نادم ہو کر اس سے باز آجائیں اور اپنی اصلاح کرلیں، تو ان سے درگذر کرو۔ قانونِ خداوندی میں معافی کی گنجائش ہے جو باعثِ رحمت بن جاتی ہے۔

۹۔ قتلِ ناحق

قرآنِ کریم کی رُو سے قتلِ ناحق سنگین ترین جرم ہے۔ اگر وہ قتلِ عمد ہے تو اس کی سزا موت ہے اگر قتل خطا ہے تو سزا دیت (خون بہا کی ادائیگی) ہے۔ (۴/۹۲-۹۳) اوپر آیات (۲۵/۶۸-۷۰) درج کی جاچکی ہیں۔ ان کی رُو سے جرمِ قتل میں بھی معافی کی گنجائش ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ مقتول کے وارث قاتل کو معاف کرسکتے ہیں یہ صحیح نہیں۔ مجرم کو معاف کر دینے کا حق کسی کو حاصل نہیں ہوتا۔ جرم، قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کا نام ہے۔ لہٰذا، اس کی عقوبت (سزا یا معافی) کا فیصلہ بھی قانونِ خداوندی کی رُو سے ہوگا۔ معافی کی گنجائش خود قانونِ خداوندی میں رکھ دی گئی ہے۔ جسے مجرم "تاب و اصلح" کی شرائط پوری کرنے سے حاصل کرسکتا ہے۔ کسی کے عطا کرنے سے نہیں۔ حتیٰ کہ (جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے) اس کا حق سربراہِ مملکت کو بھی حاصل نہیں۔ یہ حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ اسی حق کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کے جرمِ قتل کو معاف کر دیا تھا۔ (۲۸/۱۶)۔ واضح رہے کہ یہ معاملہ خدا اور اس کے ایک نبیؐ کے درمیان تھا جس کے ساتھ خدا براہِ راست ہم کلام ہوجاتا ہے لہٰذا، حضرت موسےٰؑ کے جرم کو خدا نے براہِ راست معاف کر دیا۔ ہمارا اور خدا کا معاملہ اس کی کتاب (قوانین) کے ذریعے سے ہے، اس لئے ہمارے جرائم کا فیصلہ خدا کی کتاب (قانونِ خداوندی) کی رُو سے ہوگا جس کی قوتِ نافذہ قرآنی حکومت ہوتی ہے۔

۱۰۔ بغاوت یا انارکی

سورۂ مائدہ میں ہے:۔

إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ ۚ ذَٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا ۖ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ○ (۵/۳۳)

جو لوگ نظامِ خداوندی (قرآنی مملکت) کے خلاف بغاوت کریں۔ یا ملک میں فساد برپا کرنے کی کوشش کریں تو ان کی سزا یہ ہے کہ انہیں قتل کر دیا جائے یا سولی چڑھا دیا جائے۔ یا مخالف سمت سے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جائیں۔ یا انہیں جلاوطن (یا نظربند) کر دیا جائے۔ یہ سزا ان کے لئے دنیا میں ذلت و رسوائی کا موجب ہوگی۔ اور آخروی زندگی میں اس سے بھی زیادہ سخت عذاب ہوگا۔

اس کے بعد ہے :-

إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِن قَبْلِ أَن تَقْدِرُوا عَلَيْهِمْ ۖ فَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (۵/۳۴)

لیکن جو لوگ اس سے از خود باز آجائیں (تائب ہو جائیں) قبل اس کے کہ تم ان پر قابو پا لو (اور اس طرح وہ مغلوب ہو جائیں) تو تمہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ قانونِ خداوندی کی رُو سے انہیں بھی معافی مل سکتی ہے۔

یہاں معافی ان کے لئے بتائی گئی ہے جو مغلوب ہونے سے پہلے ہتھیار رکھ دیں اور تائب کی شرط پوری کر دیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس صورت میں ان سے مؤاخذہ نہیں کیا جا سکتا۔ سوال یہ ہے کہ اگر مغلوب ہونے کے بعد وہ شرمسار اور نگوں سار ہوں اور ان میں اصلاح کا امکان نظر آئے تو پھر بھی انہیں معاف کیا جا سکتا ہے یا انہیں بالضرور سزا دی جائے گی۔ حضور نبی اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اس کا فیصلہ قرآنی حکومت پر چھوڑا گیا ہے کہ (جس طرح وہ قرآن میں تجویز کردہ سزاؤں میں سے، حسبِ موقعہ کوئی سی سزا بھی دے سکتی ہے، اسی طرح) وہ اگر مناسب سمجھے تو انہیں اصلاح کا موقع بھی دیا جا سکتا ہے۔ قریشِ مکہ نے نہ صرف قرآنی حکومت کے خلاف بغاوت کی بلکہ وہ چھ سات سال تک مسلسل ان کے خلاف لڑائیاں لڑتے رہے اور انہوں نے ہتھیار اس وقت رکھے جب مکہ فتح ہو گیا۔ اب وہ سب پابجولاں حضورؐ کے سامنے تھے۔ قرآن کی رُو سے آپ کو اختیار تھا کہ ان سزاؤں میں سے جو سزا مناسب سمجھتے، ان پر قرار کر دیتے۔ لیکن حضورؐ نے ان سے فرمایا کہ لا تثریب علیکم الیوم۔ "جاؤ! تم سے کوئی مؤاخذہ نہیں"۔ (یہ الفاظ حضرت یوسفؑ نے اپنے مجرم بھائیوں سے کہے تھے۔ ۱۲/۹۲)۔ حضورؐ کے اس عفوِ کریمانہ کا نتیجہ وہ نکلا جس سے نہ صرف قریش، مدینہ اور حجاز کی بلکہ ساری دنیا کی تاریخ بدل گئی۔

اس سے مستنبط ہوتا ہے کہ کسی جرم کی سزا تو قرآن کے خلاف نہیں دی جا سکتی لیکن عفو کی گنجائش بہرحال ہوتی ہے۔

---(۰)---

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے، قانون کا نفاذ مشینی ضوابط کے مطابق، آنکھ بند کر کے پھانسی گھما دینا نہیں۔ اس میں انسانی تقاضوں (HUMAN - CONSIDERATIONS) کو ملحوظ رکھنا مقدم ہوتا ہے۔ قانون کا مقصد فرد اور معاشرہ کی اصلاح ہے انتقام جوئی یا اذیت رسانی سے حصولِ لذت (SADISM) نہیں۔ اگر یہ مقصد، مجرم کو اصلاح کا موقعہ دینے سے حاصل ہو سکتا ہے، تو پھر سزا دینے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ سزا کی ضرورت اس وقت پیش آئے گی جب مجرم میں تبدیلیٔ ذہنیت کا امکان نہ ہو، اور معاشرہ کو اس کی حیوانیت یا درندگی سے بچانا مقصود ہو۔ دیکھئے! خدائے غفور و رحیم نے اسے کتنے پیارے انداز میں بیان کیا ہے جب کہا کہ مَا يَفْعَلُ اللَّهُ بِعَذَابِكُمْ إِن شَكَرْتُمْ وَآمَنتُمْ ۚ وَكَانَ اللَّهُ شَاكِرًا عَلِيمًا (۴/۱۴۷)

"اگر تم حق کو مانو اور قانون کے احترام کا دل سے یقین کرو، تو خدا نے تمہیں سزا دے کر کیا لینا ہے؟"
وہ مستبد اور ظالم حکمران نہیں۔ وہ انسانی کمزوریوں سے واقف ہے اور حسن عمل کا قدردان ہے۔
یہ ہے وہ ماٹو (MOTTO) جسے قرآنی مملکت کے ارباب حل و عقد اور کارپردازانِ نظم و نسق کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھنا چاہیئے۔

اس کے لئے بنیادی ضرورت اس امر کی ہے کہ خود قانون کے اندر، عفو و تخفیف کی گنجائش رکھی جائے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، قرآنی قوانین میں تو (ہر جرم کے ضمن میں) اس کی گنجائش موجود ہے۔ انتظامیہ کے لئے جو قواعد و ضوابط مرتب کئے جائیں، ان میں اتنی لچک اور وسعت رکھنی چاہیئے کہ فیصلہ کرنے والا، انسانی تقاضوں کی رعایت رکھ کر، ان کے مطابق فیصلہ کر سکے۔

آپ کہیں گے کہ اگر ہر جرم کے لئے معافی کی گنجائش ہو، اور ہر انتظامی ضابطہ میں لچک اور وسعت ہو، تو اس سے بدعنوانی (CORRUPTION) کے دروازے کھل جائیں گے۔

آپ کا اعتراض بجا ہے۔ موجودہ نظام اور معاشرہ میں؛ جہاں جرائم بھی ناقابل معافی ہیں، اور انتظامی قواعد و ضوابط بھی بے لچک، اس قدر بدعنوانی ہے۔ تو اگر ان میں ایسی لچک اور گنجائش رکھ دی جائے تو اس سے یقیناً بدعنوانی کے پھاٹک کھل جائیں گے۔

لیکن ایسا کہتے وقت ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ جن قوانین و ضوابط کا اوپر سے ذکر چلا آرہا ہے وہ قرآنی مملکت کے قوانین و ضوابط ہیں۔ قرآنی نظام کے تحت ان کا نفاذ ہوگا اور ان کے نافذ کرنے والے قرآنی سیرت و کردار کے حامل ہوں گے۔

سیرت و کردار

قرآنی نظام میں، ناجائز دولت تو ایک طرف، اپنی ضرورت سے زائد جائز دولت رکھنے کی بھی اجازت نہیں ہوگی۔ اس میں نہ جائدادیں کھڑی کی جا سکیں گی، نہ جاگیریں قائم کرنے کی گنجائش ہوگی۔ جہاں تک کارپردازانِ نظم و نسق کا تعلق ہے، ان کی کیا کیفیت ہوگی، اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگائیے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے دورِ خلافت میں بیت المال سے ایک مزدور کی روزانہ اُجرت کے مطابق وظیفہ لیا۔ وفات کے وقت، باچشمِ پُرنم کہا کہ معلوم نہیں میں نے مسلمانوں کے بیت المال سے جتنا لیا ہے اس کے مطابق ان کی خدمت بھی کر سکا ہوں یا نہیں۔ بہتر ہو کہ اس حساب کو یہیں چکا دیا جائے۔ ایک چھوٹا سا قطعۂ زمین تھا۔ اسے بیچا اور جتنی رقم بنتی تھی اسے بیت المال میں جمع کرا دیا۔

اس سیرت و کردار کے حامل ہوں گے وہ افراد جو ان قواعد و قوانین کو نافذ کریں گے!

قانون کے نفاذ میں یہ حضرات انسانی کمزوریوں اور معاشرتی مقتضیات کا کس قدر خیال رکھتے تھے، ہمارے صدرِ اوّل کی تاریخ کے اوراق اس کے شاہد ہیں۔ مشہور واقعہ ہے کہ ابن بلتعہؓ کے ملازموں نے کسی کی اونٹنی چرا کر ذبح کر کے کھا لی۔ جرم ثابت ہو جانے پر حضرت عمرؓ نے سزا کا حکم سنا دیا لیکن ایک ثانیہ کے توقف کے بغیر کہا کہ ذرا ٹھہرو۔ میں یہ معلوم کر لوں کہ انہوں نے اس جرم کا ارتکاب کیوں کیا تھا!.....
دریافت کرنے پر مجرموں نے کہا کہ ہمارا مالک ہم سے کام تو پورا لیتا ہے لیکن کھانے کو اتنا کم دیتا ہے کہ اس سے

ہمارا پیٹ نہیں بھرتا۔ ہم نے بھوک سے مجبور ہو کر ایسا کیا ہے۔ آپ نے مجرموں کو رہا کر دیا ابن بلتعہؓ کو بلا کر کہا کہ اس دفعہ تو میں تمہیں صرف اتنی سزا دیتا ہوں کہ اونٹنی کے مالکوں کو اس کی قیمت ادا کر دو۔ اگر آئندہ تم نے اپنے ملازموں کو بھوکا رکھا اور وہ اس قسم کے جرم کے ارتکاب پر مجبور ہو گئے تو اس جرم کی سزا تمہیں دی جائے گی۔

دار قطنی کی یہ روایت بھی ہمارے سامنے ہے کہ سرقہ کا ایک مجرم حضورؐ نبی اکرم کے سامنے لایا گیا لیکن آپ نے اسے معاف کر دیا۔ پھر دوسری مرتبہ اس نے چوری کی لیکن آپ نے اسے پھر معاف کر دیا۔ اسی طرح تیسری مرتبہ اور چوتھی مرتبہ بھی۔ جب اس نے پانچویں مرتبہ چوری کی تو پھر آپؐ نے سزا نافذ فرمائی ..... (کنز العمال)۔ روایت میں یہ تو نہیں بتایا گیا کہ اس بار بار معافی کی بنیاد اور وجہ کیا تھی، لیکن یہ تھا قرآن کے اس حکم کے عین مطابق کہ سزا صرف عادی مجرموں کو دی جائے۔

حضرت عمرؓ کے متعلق عام طور پر کچھ ایسا نقشہ سامنے آتا ہے کہ وہ بڑے سخت مزاج، کرخت اور درشت قسم کے انسان تھے۔ لیکن درحقیقت وہ ایسے نہیں تھے۔ وہ اپنے سینے میں کس قدر گداز قلب رکھتے تھے اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگائیے کہ ایک دفعہ انہوں نے کسی شخص کو گورنری کے لئے منتخب کیا۔ اس کی تعیناتی کا پروانہ لکھا رہے تھے کہ ایک بچہ آیا۔ آپ کی گود میں بیٹھ گیا اور آپؓ نے اُسے پیار کیا۔ اس نامزد گورنر نے کہا کہ امیرالمؤمنین! میرے دس بچے ہیں لیکن کوئی میرے پاس پھٹک نہیں سکتا۔ اس پر آپؓ نے کہا کہ اس میں میرا کیا قصور! اگر خدا نے تیرے دل سے رحم نکال دیا ہے، تو میں کیا کروں؟ اس سے یہ کہا اور کاتب سے کہا کہ دستاویز پھاڑ دو۔ جو شخص اولاد کے ساتھ شفقت اور محبت سے پیش نہیں آسکتا، وہ رعایا پر کیسے رحم کرے گا!

آپ نے غور فرمایا کہ اس نظام میں انتظامیہ کے لئے کس قسم کے افراد کا انتخاب ہوتا تھا؟ جہاں تک ان کی گھریلو زندگی کا تعلق ہے وہ "مشینی ضوابط" کے تابع نہیں ہوتی تھی۔ انسانی لطافت اور نزاکت کا عکس ہوتی تھی۔ ایک دفعہ ایک شخص آپؓ سے اپنی بیوی کی شکایت کر رہا تھا۔ آپؓ نے فرمایا کہ میرے بھائی! میاں بیوی کی زندگی میں تصوراتی (IDEAL) معیار تلاش نہیں کیا کرتے۔ یہ عملی زندگی ہوتی ہے۔ اس میں داد و ستد (GIVE-AND-TAKE) کا مسلک اختیار کرنا چاہیئے۔

آپ فرمایا کرتے تھے کہ انسان کو چاہیئے کہ اپنے اہل و عیال میں بچوں کی طرح رہے، اور مرد صرف اس وقت بنے جب ان کی کوئی ضرورت اس کے سامنے آئے۔

"عمرؓ کا دُرّہ" تو ضرب المثل بن چکا ہے۔ لیکن اس دُرّے کی حقیقت کیا تھی، اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگائیے۔ آپؓ بازار سے گذر رہے تھے کہ دیکھا ایک شخص شارع عام پر ایک عورت سے باتیں کر رہا ہے۔ غصہ آگیا۔ گئے اور اسے ایک بید رسید کر دیا۔ اس نے کہا۔ امیرالمؤمنین! یہ میری بیوی ہے۔ فرمایا: تیری بیوی ہے تو سربازار اس سے باتیں کیوں کر رہا ہے۔ خواہ مخواہ مسلمانوں کو بدظنی اور غیبت پر مجبور کر رہا ہے!

اس نے کہا: امیرالمؤمنین! ہم نووارد ہیں۔ ابھی ابھی شہر میں داخل ہوئے ہیں۔ باہم مشورہ کر رہے ہیں

کہ ہم کہاں ٹھہریں۔ یہ بات بہرحال اسی جگہ کھڑے ہو کر کی جا سکتی تھی۔

یہ سُن کر آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہی بید اس کے ہاتھ میں دیا اور کہا: اے بندۂ خدا! اپنا بدلہ لے لے۔ اس نے معذرت کرتے ہوئے کہا:۔

امیرالمؤمنین! یہ دُرّہ آپ کا ہے۔ آپ ہی اپنے ہاتھ میں رکھیئے۔

اس کے جواب میں آپؓ نے فرمایا:۔

سنو میرے بھائی! یہ دُرّہ نہ میرا ہے، نہ تمہارا۔ یہ اللہ کا دُرّہ ہے۔ اسے اللہ کی راہ میں اٹھنا چاہیئے۔ اٹھانے والا کوئی ہو۔

اس نے کہا کہ

یہ درست ہے کہ یہ دُرّہ اللہ کا ہے۔ لیکن اللہ نے اُسے آپؓ ہی کو دیا ہے۔ یہ آپؓ کو مبارک ہو۔

یہ تھا وہ معاشرہ جو قرآنی قوانین و ضوابط کی رُو سے قائم ہوتا تھا۔ یا یوں کہیئے کہ اس قسم کے تھے وہ انسان جنہیں قرآن تخلیق کرتا تھا۔ اور جن کے ہاتھوں یہ معاشرہ ترتیب پاتا تھا۔ ہماری بنیادی غلطی یہ ہے کہ ہم باتیں کرتے ہیں اسلامی نظام۔ اسلامی قوانین۔ اسلامی شریعت کی، اور انہیں نافذ کرنا چاہتے ہیں موجودہ معاشرہ میں جس کی کوئی کَل بھی اسلامی نہیں۔ جب وہ اس میں فٹ (FIT) ہوتے نظر نہیں آتے تو طرح طرح کے اعتراضات اُبھرتے ہیں اور اس کا خمیازہ (بیچارے) اسلام کو بھگتنا پڑتا ہے۔ ہم سوچتے نہیں کہ سیکولر سٹیٹ یا تھیاکریسی میں اسلامی نظام قائم کیسے ہو سکے گا؟ اسلام تو انہیں مٹانے کے لئے آیا تھا۔ اس نے اسلامی نظام کے قیام کی شرطِ اوّل "کفر بالطاغوت" بتائی تھی۔

(فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ... (2/256))

ہم "طاغوتی" بنیادوں پر "ایمان باللہ" کی عمارت استوار کرنا چاہتے ہیں! نتیجہ ظاہر ہے۔ اسلامی قوانین، اسلامی نظام ہی میں نافذ ہو سکتے ہیں۔

(۰)

آخر میں ایک اعتراض کا جواب، یا ایک نکتہ کی وضاحت۔

مجھ سے اکثر کہا جاتا ہے کہ جب اسلامی قوانین و ضوابط، اسلامی مملکت ہی میں نافذ ہو سکتے ہیں، اور اسلامی مملکت اس وقت دنیا میں کہیں بھی نہیں تو آپ اسلامی مملکت، اسلامی تصورات، اسلامی قوانین، وغیرہ کی تحقیق میں اپنا وقت اور توانائی کیوں ضائع کرتے ہیں اور انہیں لکھتے لکھاتے کاہے کے لئے ہیں؟

اعتراض کی حد تک میں ان حضرات سے متفق ہوں، لیکن اس کے باوجود، میں جو، بقول ان کے "اس سعیٔ لاحاصل میں اپنا وقت اور توانائی ضائع کر رہا ہوں" تو اس کا ایک خاص مقصد ہے۔ میں جب اپنے تاریخی سرمایہ پر نگاہ ڈالتا ہوں تو اس میں۔ اسلامی نظام، اسلامی سیاست یا اسلامی ریاست کے متعلق قرآنی نقطۂ نگاہ سے لکھا ہوا کچھ بھی نہیں ملتا۔ جو کچھ لکھا ملتا ہے وہ ہمارے (مسلمانوں کے) دورِ ملوکیت کی تاریخ ہے۔ اور ملوکیت میں، قرآنی نقطۂ نگاہ سے یا تو کچھ لکھا ہی نہیں جا سکتا تھا، اور اگر کسی صاحبِ ہمت

نے اس کی جرأت کی ہوگی تو تھیاکریسی نے اس کا ایک ایک ورق ضائع کر دیا ہوگا۔ تھیاکریسی کی انتہائی کوشش یہ رہی ہے (اور ہے) کہ قرآن بے نقاب ہو کر اُمت کے سامنے نہ آنے پائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج جو کچھ اسلامی ریاست سے متعلق تحقیق کے نام سے پیش کیا جا رہا ہے، وہ اسی دورِ ملوکیت کی ریاست کا نقشہ ہے جس پر اسلام کا لیبل لگا دیا گیا ہے۔

اندریں حالات، اگر کوئی شخص نیک نیتی سے بھی چاہے کہ معلوم کرے کہ صحیح اسلامی (قرآنی) ریاست اور سیاست کے اصول و مبانی اور خط و خال کیسے ہوں گے، تو اس کے لئے اسے تاریخ میں کوئی مواد نہیں ملے گا۔ بجز صدرِ اوّل کے منتشر واقعات کے۔ مجھے اس کا دعویٰ نہیں کہ میں قرآن پر اتھارٹی ہوں۔ لیکن میں نے بہرحال، اپنی عمر کا بڑا حصہ اس پر غور و تدبر میں گذارا ہے اور اس کے ریاستی، سیاسی، معاشرتی، عمرانی، معاشی نظام کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنے حاصلِ مطالعہ و تدبر کو منضبط اور محفوظ کر جاؤں تاکہ اگر آنے والے کسی دور میں، کسی نے اس راستے پر چلنے کی کوشش کی، تو اس پر میرے نقوشِ قدم دیکھ کر شاید اس کا حوصلہ بندھ جائے کہ یہ راستہ ویرانہ نہیں۔ اس پر اس سے پہلے بھی کوئی گامزن ہوا ہے۔ اس طرح میری یہ کوششِ ناتمام، اس کے لئے مفیدِ مطلب ہو جائے۔ یہ ہے میرا مقصد جس کے لئے میں نے اپنی عمر کا ایک ایک لمحہ اس کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ ؎

قدم قدم پہ جلاتا ہوں خونِ دل کے چراغ — یہ سوچ کر کوئی پیچھے بھی آ رہا ہوگا

اگر ایسا ہو گیا تو میں سمجھوں گا مجھے میری محنتوں کا صلہ مل گیا۔ ویسے اس وقت بھی ملک (اور بیرونِ ملک) انفرادی طور پر ایسے اربابِ دانش و بینش موجود ہیں جو میری قرآنی فکر کو بنظرِ استحسان دیکھتے اور اس سے استفادہ کرتے ہیں اور اس طرح قرآنی تصوراتِ حیات کے قریب تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ مذہبی پیشوائیت نے ترہیب و نفرت کی جو فضا عام کر رکھی ہے، اس کے پیشِ نظر میں اسے بھی مغتنمات میں سے سمجھتا ہوں۔ میری حالت تو (علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں) یہ ہے کہ ؎

مرا در عصرِ بے سوز آفریدند — بخاکم جانِ پُر شورے دمیدند
چو نخ در گردنِ من زندگانی — تو گوئی، بر سرِ دارم کشیدند — (ارمغانِ حجاز صفحہ ۱۹۹)

اسی لئے میں ان حضرات سے کہا کرتا ہوں کہ ؎

ز مرغانِ چمن نا آشنایم ! — بشاخِ آشیاں تنہا سرایم !
اگر نازک دلی، از من کراں گیر
کہ خونم می تراود از نوایم ! — (پیامِ مشرق صفحہ ۲۶)

پرویز

(۰)